Mairaj

Vol 3, Issue 1

https://www.mairaj.pk editor.mairaj@gmail.com

ISSN Online 2959-2089 ISSN Print 2959-2070

ڈاکٹر قندیل بدر

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، سردار بہادر خان ویمن یونیورسٹی بلوچستان، کوئٹہ

اردو انشائیہ اور اس صنف میں ڈاکٹر وزیر آغا کی تخلیقی اور تنقیدی خدمات کا جائزہ

Dr. Qandeel Bader

Assistant Professor, Department of Urdu,Sardar Bahadur Khan Women University, Balochistan, Quetta

Informal Essay In Urdu And Dr. Wazir Agha's Creative And Critical Contributions To This Genre

This article briefly highlights the origins of the genre of composition in the West and Urdu, followed by a brief discussion of all the debates that have taken place in relation to determining the characteristics of this genre in Urdu.After this, a brief mention is made of the creative and critical efforts that Dr. Wazir Agha has made towards making this genre popular in Urdu. A comprehensive discussion on one of his famous compositions, "Charwaha", has also been made to clarify the characteristics of Dr. Wazir Agha's compositional style.

Keywords: Informal Essay, Urdu Prose, Dr. Wazir Agha, Creative Expression, Literary Criticism, Humor and Irony, Modern Urdu Literature

بیسویں صدی کے نصف آخر میں علمی، ادبی اور سیاسی تحریکوں نے برصغیر کے لوگوں کے ذہنی رویے تبدیل کرنے شروع کیے۔ نئے خیالات اور تازہ تجربات نے علوم وفنون کو نئی کروٹوں سے آشنا کرنا شروع کیا۔ چناں چہ اس منتشر خیالی کے دور میں یہاں کے لکھاریوں کو اظہار ذات کے لیے نئے ادبی سانچوں کی بھی ضرورت پڑی۔ جہاں اظہار وابلاغ کے کئی پیکر دریافت ہوئے وہاں انشائیہ کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ دیگر نثری اصناف کی طرح اس کے سانچے بھی مغرب سے مستعار لیے گیے۔ لیکن بہ طور صنف اظہار انشائیہ کی کوئی جامع اور مانع تعریف کرنا ممکن نہیں۔ کسی بھی صنف کی تعریف متعین کرنا بذات خود ایک مشکل عمل ہے۔ ادبی اصناف کو کسی بھی حدود و قیود میں پابند نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مسئلہ صرف انشائیے تک محدود نہیں بل کہ ادب کی تمام اصناف اپنی شناخت اور اپنے خدوخال کو ریاضیاتی فارمولوں کے تحت نہیں ڈھال سکتی۔ ادب کے اپنے اصول وضوابط اور اپنے قاعدے قوانین ہوتے ہیں جو ہر لکھاری کے اسلوب کے ساتھ اپنا رنگ ڈھنگ تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے جب انشائیہ کے خدوخال کے تعین کا مسئلہ درپیش آیا تو کئی اصناف میں انشائی عناصر معلق نظر آئے اور اس کے ساتھ ساتھ انشائیہ کی بنت میں بھی کئی اصناف کا واضح عمل دخل دکھائی دیا۔

قلیل العمر یہ صنف اول دن سے متنازع رہی ہے کیوں ہر لکھاری نے اسے اپنے ذاتی اسلوب کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی اور اپنے ہر طرح کے لطیف مضامین پر انشائیہ کا لیبل چسپاں کر دیا چناں چہ طویل عرصے تک طنز ومزاح اور انشائیہ کے مابین حد بندی نہیں ہو سکی لہذا ایک ہی مضمون میں کئی ذائقے ابھرتے رہے۔ ابتدا میں انشائیہ اور مضمون میں فرق واضح نہ تھا، مگر رفتہ رفتہ ادبی شعور کی پختگی کے ساتھ انشائیہ ایک مستقل اور باقاعدہ صنف کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ بڑی حد تک ڈاکٹر وزیر آغا ہی وہ شخصیت ہیں جنھوں نے انشائیے کی صنفی حدود کا تعین کیا۔ مشکور حسین یاد نے انشائیہ کو ''ام الاصناف'' کہا۔ ان کے مطابق ادب اور انشائیہ ایک ہی شے کے دو نام ہیں اس لیے ہر ادیب اس صنف کا موجد ہے اور دنیا کی ہر زبان میں جہاں ادب کا آغاز ہوا وہیں انشائیہ بھی وجود میں آیا۔ ان کی تعریف کے باوصف اس صنف کی حدود لامتناہی ہیں۔ جو ادیب جس شکل میں بھی اپنے جذبات صفحہ قرطاس پر منتقل کر دے اسے انشائیہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

انشائیہ کا لفظ عربی لفظ انشا سے نکلا ہے۔ اس لفظ کے معنی عبارت، تحریر، دل سے بات پیدا کرنا، علم معانی وبیان، صنائع بدائع، خوبی عبارت، طرز تحریر، وہ جملہ جس میں جھوٹ سچ کا گمان نہ ہو، جیسے مفاہیم کا مجموعہ ہے۔ انشا کا مادہ (نش ءا) ہے جس کے لغوی معنی پیدا کرنے کے ہیں۔ یعنی انشاء کی علت غایت، زائید گی یا آفرید گی کے ہیں۔ اردو میں انشائیہ کا لفظ انگریزی لفظ Essay کے متبادل کے طور پر رائج ہوا۔ Essay دراصل فرانسیسی لفظ Assai سے ماخوذ ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ Assai کو عربی لفظ

'اسعی' سے مشتق مانا جاتا ہے جب کہ انشا بھی عربی زبان کا لفظ ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ یہ لفظ یونانی سے فرانسیسی میں منتقل ہوا۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں کیوں کہ اندلس اور جنوبی فرانس کی زبان وثقافت پر عربوں کے اثرات کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس لیے اس لفظ کو عربی سے ماخوذ قرار دینا بھی معقول دکھائی دیتا ہے۔ اسعی کا عربی مادہ ہے 'سعی'، جس کے معنی کوشش کے ہیں۔ یوں اس صنف کو لکھنے کے لیے جو محنت درکار ہے وہ اس کے معنی سے بھی متشکل ہے۔

انشائیہ بنیادی طور پر Essay ہی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریزی ادب میں 'ایسے' کی اصطلاح بے حد وسعت کی حامل رہی ہے اور اس کے تحت ہر قسم کے سنجیدہ، طنزیہ ومزاحیہ، تنقیدی وتحقیقی، اصلاحی وفلسفیانہ مضامین لکھے جاتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی ایسیز کے انتخابی مجموعوں میں ہر طرح کے مضامین شامل کیے جاتے ہیں۔ اردو میں جدید انشائیہ کے نام سے جو صنف رائج ہے وہ دراصل انگریزی ہی سے ماخوذ ہے۔ بشیر سیفی لکھتے ہیں:

''لفظ "ایسے" فرانسیسی زبان کی دین ہے۔ عام طور پر ادب کی اس صنف کا موجد فرانسیسی ادیب مونتین مانا جاتا ہے۔ مونتین سے لے کر دور حاضر تک کے انشائیہ نگاروں اور انشا پردازوں نے ایسے کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس اصطلاح سے ان لوگوں کا مقصود علمی یا تنقیدی مضمون نہیں بل کہ Light + Personal Essay رہا ہے۔'' ؎۱

مغرب میں اس صنف کے ابتدائی آثار سترھویں صدی میں نمودار ہونا شروع ہوئے۔ ابراہیم کاولے اور ان کے ہم عصر ولیم کارن ولس نے ابتدائی طور پر 'ایسے' کے تخلیقی اثاثے میں بھرپور اضافہ کیا۔ ان کے علاوہ سترھویں صدی اس صنف کی تخلیق کے حوالے سے بالکل بانجھ دکھائی دیتی ہے۔ اس دور میں ادبی، تنقیدی، فلسفیانہ، مذہبی ایسیز ضرور موجود ہیں لیکن انشائیہ کی باقاعدہ ابتدا میشل ڈی مونتین (Michel de Montaigne) سے ہوئی جسے اس صنف کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ مونتین فرانس میں اس صنف کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور نقطۂ انجام بھی۔ اٹھارویں صدی کے اوائل میں انگریزی انشائیہ کو دو اہم تخلیق کار میسر آئے۔ ایڈیسن اور سٹیل۔ ان دونوں نے انگریزی 'ایسے' کی روایت کو پروان چڑھایا اس کے خدوخال متعین کیے آج اس صنف کی تمام تر ترقی دراصل انہی کی تخلیقی کاوشوں کا ثمر ہے۔ ان کے بعد جو نام اہمیت کے حامل ہیں وہ ہیں گولڈ سمتھ اور جانسن۔ جانسن نے انشائیہ کو A Loose Sally of Mind قرار دیا۔ اس کی یہ تعریف آج بھی انشائیہ کے حوالے سے انتہائی معروف گردانی جاتی ہے۔ ان کے بعد لی ہنٹ، ولیم ہیزلٹ، چارلس لیمب، جی کے چیسٹرسن، اے جی کارنر، رابرٹ لنڈ، ورجینا وولف وغیرہم وہ اہم نام ہیں جو اس صنف کے حوالے سے اپنی الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے۔

ادب میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی۔ خصوصاً اصناف ادب کی تعریف تو بے حد مشکل کام ہے کیوں کہ ایک خلاق ذہن تخلیقی لمحات میں فنی سانچوں اور ضابطوں کو جزوی اور بسا اوقات کلی طور پر توڑتا پھوڑتا رہتا ہے۔ اور یوں نئے سانچے اور ضابطے وجود میں آتے رہتے ہیں۔ انشائیہ عمومی مضمون اور طنزیہ اور مزاحیہ مضمون سے الگ کیا جاسکتا ہے۔ انشائیہ مضمون نگاری کا وہ لازمی جزو ہے جس میں مصنف اپنے ذاتی اور انفرادی تجربات کو پیش کرتا ہے۔ اس پیش کش میں اس کی شخصیت نمایاں رہتی ہے اس طرح انشائیہ میں ایک خاص قسم کا داخلی رنگ پایا جاتا ہے مگر مضمون میں خارجی رنگ غالب رہتا ہے۔ بہ قول پروفیسر جمیل آذر:

''اپنے اس مخصوص مزاج کی بنا پر انشائیہ ایک لطیف صنف ادب ہے کیوں کہ اس میں غزل کا سا ایجاز، افسانے کا سا تاثر، ناول کا سا فلسفہ حیات اور ڈرامے کے سے انتظاریہ لمحات اور ان کے پس منظر میں شگفتگی کی دھیمی دھیمی سمفنی (Symphony) ہوتی ہے اور ان سب پر مستزاد انکشاف ذات کا عمل جو خاص انشائیہ کے لیے مختص ہے۔ یہی وہ مقتضیات ہیں جن کا انشائیہ میں ہونا ضروری ہے۔ انشائیہ کے روپ مختلف اصناف ادب میں کس طرح ظہور پذیر ہوئے ہیں میں جب بھی کسی ناول، نظم، غزل، افسانہ، سفر نامہ یا آپ بیتی کا مطالعہ کرتا ہوں تو مجھے انشائیے کے عناصر مل جاتے ہیں انشائیہ کی پہلی پہچان تو یہی ہے کہ اس میں تخلیقی حسن ہو، نیاپن اور اصلیت ہو اور بے ساختگی ہو انفرادی سوچ کا حامل ہو اور مصنف کی ذات کی مکمل شمولیت ہو۔'' ؎۲

انشائیہ کی حتمی صورت کی عدم موجودگی اور اس کے ادبی عناصر کی ہر صنف میں موجودگی نے اسے ازحد پیچیدہ اور عسیر الفہم بنا دیا یوں ناقدین نے ہر صنف حتیٰ کہ قدیم داستانوں کے انشائی حصوں کو بھی انشائیہ تصور کر لیا۔ محمد اسد اللہ کے باوصف:

''تصوف کے موضوعات جس اسلوب میں اظہار کی منزل تک پہنچے وہ انشائیہ کا انداز تھا یہی وجہ ہے کہ ''سب رس'' کے وہ حصے جن میں حکمت ودانش کی باتیں تمثیلی پیرائے میں بیان کی گئی ہیں انھیں جاوید وششٹ نے منتخب کر کے انشائیہ کے طور پر کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔ جاوید وششٹ کے خیال میں ''سب رس'' کا مصنف ملا وجہی اردو انشائیہ کا باوا آدم ہے۔'' ؎۳

انشائیہ کی اصطلاح جب انگریزی ایسے کے مترادف کے طور پر رائج ہوئی اور اسے ایسے کا متبادل بتایا گیا تو یہ فرض کر لیا گیا کہ سر سید احمد خان سے لے کر دور حاضر تک کے جتنے بھی ادبی، علمی، طنزیہ و مزاحیہ اور انشائی مضامین لکھے گئے وہ سب انشائیہ ہیں۔ انشائیہ بھی انگریزی ایسے کے مترادف ہے اور مضمون بھی۔ بالفاظ دیگر انشائیہ کو مضمون کا مترادف تصور کر لیا گیا اور ہر قسم کے مضامین کو انشائیہ کہا جانے لگا۔ اس میں شک نہیں کہ اردو ادب کی اصطلاح مضمون بھی انگریزی ایسے ہی کے مترادف ہے لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اردو میں باقاعدہ مضمون نگاری کا آغاز سر سید احمد خان سے ہوتا ہے۔ اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ وہ ادب برائے ادب کے قائل نہیں تھے ان کے نزدیک ادب ان کے اصلاحی مقاصد کے حصول کا ایک کار آمد ذریعہ تھا۔ لہذا انہوں نے ان ہی انگریز مصنفین سے اثر قبول کیا جو اپنے وقت کے مصلح ادیب تھے اور سر سید ہی کی طرح انگریز معاشرے کو قباحتوں سے پاک کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے کی اصل روح کے مطابق انشائیہ لکھنے کی بہ جائے اپنے اصلاحی مقاصد کے تحت ' ایسے ' کے نام پر اصلاحی مضامین اور سنجیدہ مقالات سپرد قلم کرتے رہے۔

انشائیہ تمام اصناف سے مختلف ہے۔ شروع سے آخر تک جدت خیال پر مبنی ہے۔ بے ساختگی بات سے بات پیدا کرنا خوش گواریت، شگفتگی اور مخفی مفاہیم کی تلاش سے انشائیہ تخلیق ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار گھسے پٹے رستوں کی بہ جائے اپنے لیے خود راستہ بناتا ہے۔ بھاری بھر کم الفاظ، منطق، فلسفہ اور غیر تخلیقی جملوں سے گریز کرتا ہے۔ خالصتاً ادبی زبان کا متحمل ہوتا ہے۔ انشائیہ ایک نثر پارہ ہے جو اپنی طوالت کے اعتبار سے آدھ صفحہ سے لے کر بیس یا زیادہ سے زیادہ پچیس صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ کیوں کہ زیادہ طوالت اس لطیف صنف پر گراں گزرتی ہے۔ انشائیہ میں موضوعیت Subjectivity ایسے ہی ضروری ہے جیسے شعر میں وزن و آہنگ۔ انشائیہ میں شخصی و غیر شخصی پہلوؤں کی آویزش ہی نہیں بل کہ انضمام بھی ہوتا ہے تاہم اس میں فلسفیانہ غور و فکر کا بوجھل پن نہیں ہونا چاہیے۔ انشائیہ کا موضوع کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ موضوع کی کوئی پابندی نہیں۔ اس میں ذاتی تاثرات ہوں لیکن تحقیقی اور استدلالی انداز نہ ہو۔ اسلوب میں شگفتگی ہو۔ تین عناصر لازمہ ہیں۔ اسلوب میں تازگی ہو تا کہ قاری لطف اندوز ہو، موضوع دلچسپ ہو، خیالات نئے ہونے چاہییں یا بیان کرنے کا انداز نیا اور اچھوتا ہو۔

انشائیے کے سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ناول افسانہ یا مضمون کے بر عکس انشائیے کا انداز غیر رسمی ہوتا ہے اس میں کسی روایتی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ اگر کسی خاص ترتیب کا خیال رکھا جائے تو اس کی انفرادیت مجروح ہونے لگتی ہے۔ لہذا انشائیہ نگار اپنی افتاد طبع یا فطری اسلوب کے مطابق انشائیے کو کہیں سے شروع کر کے کہیں بھی ختم کر سکتا ہے۔ انشائیہ نگار اپنے موضوع کے انوکھے پہلوؤں کو پیش کرتا ہے۔ انشائیے کا موضوع ہلکا پھلکا ہوتا ہے۔ یہ کلیتاً مصنف کی اندرونی شخصیت کا بیان ہوتا ہے۔ لہذا خارجیت کے بہ جائے داخلیت اس کا امتیازی وصف ہے۔ انشائیہ نگار در حقیقت اشیا کے مخفی مفاہیم تک پہنچ کر قارئین کے بے لگام جذبوں کی تہذیب کرتا ہے اور انہیں متوازن سطح پر لاتا ہے ۔ کسی خاص ہیئت کے بجائے اس صنف کا اپنا ایک خاص مزاج ہے وہی اس کی پہچان ہے۔ المختصر انشائیہ اردو ادب کی ایک صنف ہے جس میں مصنف کسی موضوع، خیال، احساس یا تجربے کو ذاتی، تخلیقی، غیر رسمی اور تاثراتی انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس صنف میں نہ تو کسی منطقی ترتیب کی سخت پابندی ہوتی ہے اور نہ ہی موضوع کو مکمل طور پر ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، بلکہ احساس، اسلوب اور فکری روانی کو اہمیت دی جاتی ہے۔ طنز، مزاح، خیال آفرینی اور ذاتی مشاہدہ انشائیہ کے نمائندہ عناصر رہے ہیں۔

ہمارے یہاں عمومی خیال یہی رہا کہ سر سید انگریزی ' ایسے ' کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے لہذا اس بدیشی صنف کی قلم سب سے پہلے اردو میں انہوں نے ہی لگائی۔ سر سید کے تحریر کردہ مضامین طبع زاد نہیں تھے بل کہ انہوں نے ایڈیسن اور سٹیل کی تقلید میں مضمون نگاری کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس لیے انہیں پہلا انشائیہ نگار ماننے میں کوئی قباحت نہیں۔ سر سید کے دور میں اصلاحی، سماجی، مذہبی قسم کے مضامین ہی کو انشائیہ سمجھا جاتا تھا۔ پھر بھی ان کے کچھ مضامین انشائیہ کے زمرے میں گنے جا سکتے ہیں مثلاً ''گزرا ہوا زمانہ''، ''امید کی خوشی''، ''سراب حیات'' اور ''بحث و تکرار'' وغیرہ میں انشائی عناصر ملتے ہیں۔ کہیں ان کے مضامین میں سنجیدگی پائی جاتی ہے اور کہیں طنز و مزاح۔

انیسویں صدی کے ربع آخر میں جب سر سید انگریزی انشائیہ سے متعارف ہوئے تو انگلستان میں مضمون نگاری کے تین پیرائے رائج تھے۔ ان میں سے ایک سنجیدہ مضمون نگاری کا وہ سلسلہ تھا جو ادب کے معاملے میں تنقید، سیاست کے میدان میں تجزیہ، اور علوم کے ضمن میں محاکمہ کو بروئے کار لاتا تھا۔ دوسرا طنزیہ اور مزاحیہ مضمون نگاری کا وہ میلان تھا جسے اخبار ''پنچ'' نے بہت فروغ دیا تھا۔ اور تیسرا خالص انشائیہ نگاری کا وہ میلان تھا جو غیر رسمی موضوعات پر غیر رسمی انداز میں طبع آزمائی کرتا تھا۔ اس کا مقصد نہ تنقید و تبصرہ تھا نہ محاکمہ اور تجزیہ۔ وہ فقط اپنے موضوع کے ساتھ کھیلتا تھا اور کھیلتے کھیلتے اس کے اندر چھپی ہوئی ان معنوی تہوں کو منکشف کرتا تھا جن تک عام لوگوں کی نظر نہیں پہنچ پاتی تھی۔ بہ قول ڈاکٹر وزیر آغا:

"سر سید طبعاً ایک سنجیدہ شخصیت تھے وہ ایک معنی کے گرویدہ اور ایک منزل کے جویا تھے اسی لیے انشائیہ کا فری سٹائل اور نٹ کھٹ انداز انہیں مرغوب نہیں تھا چناں چہ وہ سنجیدہ مضمون نگاری کی طرف راغب ہوئے اور اسی کو انہوں نے اردو ادب میں رائج کیا۔ مگر چوں کہ سنجیدہ مضمون نگاری کے علاوہ مغرب کے انشائیہ یعنی Light Essay سے بھی متعارف تھے لہذا موضوعات کے انتخاب میں انہوں نے 'لائٹ ایسے' سے بھی استفادہ کیا۔ مگر یہ استفادہ محض موضوعات کے عنوانات کی حد تک تھا کیوں کہ موضوعات پر لکھتے ہوئے انہوں نے انشائی انداز کی بہ جائے خالص مضمون نگاری کے انداز کو برتا۔ اور اپنے مضامین کے ذریعے تعمیر و ترقی کے لیے ہدایات جاری کرتے رہے۔ اسی لیے سر سید انشائیہ نگار نہیں ہیں بعض لوگ جنھیں وہ انشائیہ نگار نظر آتے ہیں وہ در اصل ان کے انشائی عنوانات سے دھوکا کھا گئے ہیں۔" ۴

سر سید کے معاصرین میں محمد حسین آزاد نے بھی انگریزی مصنفین ایڈیسن، سٹیل اور جانسن کے تراجم کیے۔ تاہم ان کے اسلوب میں انشاپردازی کا عنصر غالب ہے۔ ان کی زبان دانی، تمثیل نگاری اور خالص مشرقی ماحول نے اس طرف کسی کو متوجہ نہیں ہونے دیا۔ ڈاکٹر محمد صادق نے آزاد کی تحریروں کو تمثیلی انشائیہ قرار دیا۔ جب کہ عبد الماجد دریاآبادی نے سر سید، حالی اور شبلی پر آزاد کو فوقیت دی ہے۔ لیکن یہاں یہ یاد رکھنا گزیر ہے کہ انشاپردازی اور انشائیہ نگاری دو مختلف چیزیں ہیں، انشاپرداز لفظوں سے کھیلتا ہے اپنی عظمت کا اظہار کرتا ہے، مشکل ثقیل الفاظ استعمال کرتا ہے جب کہ انشائیہ نگار سادہ اور سلیس زبان استعمال کرتا ہے، تخلیقی زقند یعنی Creative Jump لگا سکتا ہے۔ سادہ سلیس اظہار خیال میں روانی ہوتی ہے انشاپردازی غیر تخلیقی چیز ہے جبکہ انشائیہ نگاری تخلیقی چیز ہے۔ ان دو معتبر حوالوں کے علاوہ آغا شاعر قزلباش، ناصر علی دہلوی، شیخ عبد القادر، نیاز فتح پوری، عبد الرشید چشتی، منشی پریم چند، مولوی عزیز مرزا، سید احمد دہلوی، مہدی افادی، سجاد انصاری، فلک پیا، سجاد حیدر یلدرم، عبد الکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، کرشن چندر، علی اکبر قاصد جیسے ادبا نے فرد کو نہ صرف زندگی کی ہمواریوں کا احساس دلایا بل کہ اپنے تلخ و ترش ردعمل سے زندگی کی بوالعجبی پر ہنسنے کا موقع فراہم کیا۔ ان کی تحریریں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انشائیہ بتدریج ارتقاپذیر ہے۔ لیکن متذکرہ بالا ادباء کی تحریروں یا مضامین کو انشائیہ کہنے میں تامل رہا ہے کیوں کہ محققین نے تو انشائیہ سے ملتے جلتے ٹکڑے داستانوں اور ناولوں میں بھی تلاش کیے ہیں لیکن بہ حیثیت 'کل' جس صنف کو آج انشائیہ کہا جاتا ہے اس کا باقاعدہ آغاز ۶۰ء کی دہائی میں ہوا۔ غفور شاہ قاسم کے یہ قول:

"انشائیہ تنقید کی صلیب پہ لٹکی صنف نثر ہے۔ انشائیہ ہمارے یہاں ہر دو حوالوں سے ایک متنازعہ صنف کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ نہ تو ابھی تک اس کی کوئی قابل قبول تعریف متعین کی جا سکی ہے نہ ہی اس بات کا متفقہ فیصلہ کے اس کا بانی کون ہے۔" ۵

پاکستان میں صنف انشائیے کا باقاعدہ آغاز ۱۹۶۱ء میں ہوا۔ اسی سال انشائیے کے دو مجموعے شائع ہوئے وزیر آغا کا مجموعہ "خیال پارے" اور نظیر صدیقی کا مجموعہ "شہرت کی خاطر"۔ یوں پاکستانی ادب میں انشائیہ کو متعارف کروانے کا سہرا انہی دو مصنفین کے سر ہے۔ آغاز سے ہی متنازع قرار پانے والی اس صنف پر اب تک بے شمار مضامین اور چار قابل ذکر کتابیں تحریر کی جا چکی ہیں۔ ان کتابوں میں ڈاکٹر انور سدید کی "انشائیہ اردو ادب میں"، ڈاکٹر سلیم اختر کی "انشائیہ کی بنیاد"، ڈاکٹر بشیر سیفی کی "اردو انشائیہ، فن اور تاریخ" اور ڈاکٹر وزیر آغا کی "انشائیہ کے خدوخال" قابل ذکر ہیں۔ جمیل ملک رقم طراز ہیں:

"انگریزی ادبیات میں ایسے کی طرح اردو ادب میں بھی مضمون سے لے کر انشاء اور انشائیہ تک کثیر الجہات، تجربات اور مباحث کی ایسی ریل پیل اور ہمہ ہمی رہی ہے جس کی آویزش اور کشمکش سے گزر کر ہر دور میں اس صنف ادب کے خدوخال واضح سے واضح تر ہوتے رہے ہیں لطف کی بات یہ ہے کہ کسی دور میں بھی اس نازک، لچک دار مگر سخت جان صنف ادب نے اپنی شکست قبول نہیں کی بل کہ سوالات اور جوابات کے تصادم میں ہمیشہ نکھرتی چلی گئی۔" ۶

وزیر آغا کے مطابق لفظ 'انشائیہ' پہلی بار شبلی نعمانی نے استعمال کیا۔ جب کہ دیگر ناقدین کے باوصف اختر اورینوی نے اکبر علی قاصد کی تصنیف "ترنگ" پر ۱۹۴۴ء میں "انشائیہ کیا ہے" کے عنوان کے تحت دیباچہ تحریر کیا، تو انشائیہ کا لفظ پہلی بار استعمال کیا اور اس صنف کے خدوخال کو پہلی بار متعین کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن انشائیہ کے سلسلے میں باقاعدہ بحث کا آغاز ۱۹۵۵ء میں مرزا ادیب کے اداریے "انشائے لطیف سے لائٹ ایسے تک" سے ہوتا ہے۔ اس صنف کے لیے اول اول لطیف پارہ کا نام تجویز کیا گیا۔ اس کے بعد 'ادب لطیف' کے مختلف اداریوں میں وزیر آغا کے مضامین کے لیے نام تجویز کرنے کی کاوشوں میں قارئین کو بھی شریک کیا گیا۔ ۱۹۵۶ء میں مرزا ادیب کے ایک اداریے میں وزیر آغا کے ایک مضمون "چھکڑا" کے لیے انشائیے کا لفظ استعمال کیا گیا۔ جس کے بعد سے یہ صنف اسی نام سے موسوم کر دی گئی۔ ۱۹۶۱ء میں وزیر آغا کی انشائیوں کی پہلی کتاب "خیال پارے" اشاعت پذیر ہوئی تو اس کے دیباچے میں فکری اور تخلیقی دونوں سطحوں پر انشائیہ کو ایک صنف ادب کے طور پر مستحکم کرنے کی شعوری کوشش کی گئی اور اس کے خدوخال مرتب کرنے کے ناقدانہ اور فنکارانہ اقدامات کیے گئے۔ مرزا ادیب نے ادب لطیف کے اداریوں میں لطیف پارہ، مضمون لطیف اور انشائے لطیف کی بحث کا آغاز

کیا تو ڈاکٹر وزیر آغا نے اس بحث کو آگے بڑھایا، خود انشائیے لکھے اور خود ہی اس کے وضاحتی امور پر مضامین بھی لکھے حتیٰ کہ چہار سمت سے انشائیہ اور انشائیہ نویسی کے بارے میں لکھا جانے لگا۔

انشائیہ پچھلے چند برسوں کے دوران ہمارے یہاں پھلا پھولا ہے اور دوسرا یہ کہ ابتدا ہی سے اس کے بارے میں اختلافی آرا پیدا ہو گئی کہ انشائیہ کو کیسا ہونا چاہیے؟ بعض حضرات نے اسے طنز و مزاح اور نثر لطیف کا ایک امتزاج قرار دیا جب کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے اسے ایک علیحدہ صنف کے طور پر متعارف کروایا۔ وزیر آغا نے بہ طور نقاد انشائیہ کی جو تعریف کی اس کے مطابق انشائیہ تخلیق بھی کیے یوں انہوں نے انشائیہ کی تنقید ہی کو ایک نئی راہ نہیں دکھائی بل کہ اس کا ایک نمونہ بھی پیش کیا۔ ان کے علاوہ غلام جیلانی اصغر، ڈاکٹر انور سدید، بشیر سیفی، اکبر حمیدی، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، کامل القادری، محمد اقبال انجم، رعنا تقی، انجم نیازی، پروین طارق، منشا یاد، شہزاد احمد، ارشد میر، ڈاکٹر ناصر عباس نیر اور جمیل آزر نے قابل ذکر انشائیے تخلیق کیے۔

غلام جیلانی اصغر نے تیس سال میں اکیس انشائیے تحریر کیے بہ ظاہر یہ بہت کم نظر آتے ہیں مگر ان کے انشائیوں کی قرات کے بعد اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ انہوں نے جس معیار کے انشائیے تحریر کیے ہیں اس سے نہ صرف اس کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا ہے بل کہ اردو ادب کا دامن بھی وسیع ہوا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کو ڈاکٹر وزیر آغا سے جو قربت حاصل رہی اس نے انہیں اس صنف کی تفہیم میں بڑی مدد دی۔ نیز انشائیہ پر کئی فکر افروز مضامین تحریر کرنے سے وہ اس صنف کی فنی باریکیوں سے بہ خوبی آگاہ ہو چکے ہیں۔ اس لیے جب انہوں نے اپنے ہاتھ میں قلم لیا تو خوب صورت انشائیے ظہور پذیر ہونے لگے۔ اکبر حمیدی کے انشائیوں کے کئی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں ان کے انشائیوں میں ان کی دیگر تخلیقی جہات بھی کارفرما دکھائی دیتی ہیں شاعری افسانے اور خاکہ نگاری کے اوصاف بھی ان کے انشائیہ میں تحلیل ہو گئے۔ ڈاکٹر سلیم آغا کے انشائیوں میں مشاہدے کی وسعت گہرائی خیال و فکر کی پختگی اور طنز و مزاح کی چاشنی کے علاوہ اظہار ذات اور انکشاف ذات میں صوفیانہ رنگ حاوی نظر آتا ہے۔ انجم نیازی کے انشائیے اسلوب کی تازہ کاری اور خیال کی ندرت کا شاہ کار قرار دیا جا سکتا ہے۔ پروین طارق اردو کی پہلی خاتون انشائیہ نگار ہیں جنہوں نے تواتر سے انشائیے تحریر کیے ان کے انشائیوں کو دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان کے انشائیے یاد رفتہ کے نقوش اور ماضی کی یادوں پر مبنی ہے ڈاکٹر ناصر عباس نیر ایک ذہین نقاد اور وسیع المطالعہ دانشور ہیں ۲۰۰۰ء میں ان کے انشائیوں کا مجموعہ " چراغ آفریدم " شائع ہوا۔ جمیل آذر کو اردو انشائیے کا مارکو پولو بھی کہا جاتا ہے انہوں نے انشائیہ لکھنے کے ساتھ ساتھ انشائی تنقید کی داغ بیل بھی ڈالی۔ ان کے انشائیوں کے دو مجموعے " شاخ زیتون " اور " رت کے مہمان " شائع ہو چکے ہیں۔

یہ نہیں کہ اردو میں انگریزی انشائیہ کے اثرات مرتب ہی نہ ہوئے، یقیناً ہوئے اور یہاں کے ادبا کی تحریروں میں انشائی عناصر بھی مل جاتے ہیں مگر انشائیہ بہ طور ایک "کل" نظر نہیں آتا یہ معجزہ پاکستان بننے کے بعد میں رونما ہوا اور پھر اردو انشائیہ نے نصف صدی سے بھی کم عرصے میں خود کو اتنا نکھار اور سنوار لیا کہ اب اسے انگریزی انشائیہ کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ بایں ہمہ اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ پودا انگلستان سے آیا ہے اور آج انگریزی اور اردو کے علاوہ کسی اور زبان میں مشکل ہی سے دست یاب ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انگلستان میں انشائیہ کی نشاۃ الثانیہ بیسویں صدی کا نصف اول ہے اور پاکستان میں اس کا نصف آخر۔ بیسویں صدی کے انگریزی انشائیہ نے اخبار کے کالموں سے جنم لیا تھا اور ہر چند کہ شروع شروع میں وہ سیاسی موضوعات سے دور رہا مگر پھر وہ بہ تدریج سیاسی موضوعات کو اپناتا چلا گیا آج صورت یہ ہے کہ انگریزی انشائیہ سیاست اور بین الاقوامیت کو انشائی انداز میں اپنا موضوع بنا رہا ہے دوسری طرف گو اردو انشائیہ بھی سیاست اور بین الاقوامیت کو ٹیبو قرار نہیں دے رہا۔ مگر مجموعی اعتبار سے دیکھیں تو اس کا رخ روح کے دیار کی طرف ہے اور وہ ماورائیت کے عناصر اور مذہبی تجربے کے اجزاء کو خود میں سمونے لگا ہے، جہت کا یہ فرق خاصا نمایاں ہے۔ اسی لیے انگریزی اور اردو انشائیہ ایک ہی روشنی پر گامزن ہیں اردو انشائیہ میں روح کے دیار کی طرف جو کھڑکی کھلی ہے اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ انشائیہ نثر کی لطیف ترین شکل ہے جس میں کسی بندھی ٹکی تکنیک سے بچ کر لطیف باتوں اور نکتوں کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ ان کا نیا پن ختم نہ ہو دوسرے یہ کہ اس کا موضوعاتی دائرہ بہت وسیع ہے زندگی کی وسعتوں کی طرح اس کی بھی کوئی حد بندی نہیں۔ اس میں مسائل و معاملات کے پہلو بہ پہلو لطیف جذبے اور احساسات بھی پیش کیے جا سکتے ہیں۔ چناں چہ انشائیہ ایک ایسی صنف ہے جس میں نثر کی سی فکری دبازت بھی ہے اور شعر کی سی لطیف حسیت بھی۔ بنیادی طور پر تو انشائیہ باطن کی چھپی ہوئی دنیا کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے اسے اظہار ذات کی ایک صورت بھی کہہ سکتے ہیں لیکن ہمارا موجودہ انشائیہ صرف انکشاف ذات تک محدود نہیں بل کہ اس کے ذریعے کائنات، خدا اور انسان کے ان دیکھے اور نامحسوس رشتوں کی پہچان بھی ہو رہی ہے اور وسیع کائنات کے دبیز اسراروں کے روحانی کیف کی بازگشت بھی سنائی دے رہی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی ہمہ جہت شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، وہ اردو مایہ ناز شاعر، ادیب، نقاد، محقق، مدیر اور انشائیہ نگار ہیں۔ انہوں نے انشائیہ کو ایک الگ، منفرد اور سنجیدہ ادبی صنف کا درجہ دلایا، یوں اگر انہیں اردو انشائیے کا بانی قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ انہوں نے انشائیہ کی تعریف، ساخت اور فکری جہات پر کئی مضامین لکھ کر اس کا تنقیدی دفاع کیا۔ انشائیہ کو بہ طور ایک الگ صنف تسلیم کروایا، مضمون اور انشائیہ کے فرق کو واضح کیا اور بتایا کہ انشائیہ ذاتی تجربے اور داخلی کیفیات کا اظہار پر مبنی صنف ہے۔ خود اپنے انشائیوں کے ذریعے اس کے خدوخال واضح کیے، محض تفریحی اور فکری پیرائے سے الگ کر کے اسے تخلیقیت سے قریب کر دیا۔ ان کے انشائیے گہرے، علامتی اور فلسفیانہ فکر کے حامل ہیں، اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے نئی نسل کو بھی انشائیہ نگاری کی طرف راغب کیا یوں اس صنف کو ادبی حلقوں میں اعتبار بخشا جس سے اس صنف کے دائرہ کار میں مزید وسعت پیدا ہوئی۔ ان کے انشائیے جب منظر عام پر آئے تو بہت سے ادیبوں نے اس نئی صنف کی طرف توجہ دی اور دیکھتے ہی دیکھتے انشائیہ نگاروں کی ایک کھیپ پیدا ہو گئی لیکن وزیر آغا کی انفرادیت اور اس صنف کے سلسلے میں ان کی خدمات ایک الگ دبستان کی صورت موجود رہی ہے۔ ان کے انشائیوں کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں خیال پارے (۱۹۶۱ء)، چوری سے یاری تک (۱۹۶۶ء)، دوسرا کنارا (۱۹۸۲ء)، سمندر اگر میرے اندر گرے (۱۹۸۹ء) شامل ہیں۔ جب کہ ان کی کلیات ''پگڈنڈی سے روڈ رولر تک'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے ان کے مطابق انشائیے کے لیے کچھ باتوں کا ہونا ناگزیر ہے۔ غیر رسمی طریقہ کار، اختصار، عدم تکمیل اور تازہ اسلوب بیان۔ ڈاکٹر رشید امجد ان کی انشائیہ نگاری سے متعلق لکھتے ہیں:

''وزیر آغا ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں جس کے کئی روپ ہیں اور یہ سارے روپ شانتی، مٹھاس اور ٹھہراؤ کے ہیں طبعیت کی یہ نفاست اور زیرکی ان کے انشائیوں کی بنیادی پہچان ہے۔ انشائیہ کے لیے علم، فکر، فلسفہ اور نفاست کا ایک جگہ جمع ہونا ضروری ہے، وزیر آغا کی شخصیت میں یہ سارے پہلو موجود ہیں اور جب وہ ان سارے پہلوؤں کے ساتھ کشف کے لمحے سے گزرتے ہیں تو شانت کا وہ مقام آتا ہے جہاں برگد کے نیچے بیٹھے ان کے ہونٹوں پر ایک پر اسرار مسکراہٹ ابھرتی ہے جس میں کائنات کے سارے راز سارے رنگ چھپے ہوئے ہیں۔''۷

ڈاکٹر وزیر آغا کا انشائیہ ''چرواہا'' ان کے مجموعے ''سمندر اگر میرے اندر گرے'' کا پہلا انشائیہ ہے۔ یہ ''خیال پارے''، ''چوری سے یاری تک'' اور ''دوسرا کنارا'' کے بعد منظر عام پر آنے والا ان کے انشائیوں کا چوتھا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل پندرہ انشائیے شامل ہیں جن میں سے بارہ نئے اور تین پرانے انشائیے ''پگڈنڈی''، ''سیاح'' اور ''بارہواں کھلاڑی'' سابقہ مجموعوں سے بالترتیب لے کر شامل کیے گئے ہیں تا کہ فکری تسلسل اور ارتقا کو بہ آسانی محسوس کیا جا سکے۔ اس مجموعے کا آغاز بھی صنف انشائیہ کی تفہیم، تنقید اور تاریخ سے متعلق ایک مکمل دستاویز ہے۔ وزیر آغا نے انشائیہ کو بہ طور ایک صنف کے رائج کرنے میں جن مسلسل کاوشوں کا مظاہرہ کیا اس کی کوئی دوسری مثال ممکن نہیں۔ انشائی تنقید کو بھی ان ہی کی بہ دولت ایک باقاعدہ دبستان کی شکل تفویض ہوئی۔ انہوں نے اس صنف کا خود ہی دفاع کیا، خود ہی اس کی تفہیم اور دائرہ بندی کی نیز اس کے اسالیب اور پیرایہ بیان کے نمونے بھی خود ہی پیش کیے۔ یوں اردو میں یہ صنف بڑی حد تک ان ہی سے موسوم ہو گئی ہے جس کا وہ کامل استحقاق رکھتے ہیں۔ ''چرواہا'' وزیر آغا کے نمائندہ انشائیوں میں سے ایک ہے۔ کیوں کہ اس انشائیے میں ان کا گیان، ان کی متانت، ان کا صوفیانہ سبھاؤ، ان کا فکری تحرک، ان کا گہرا مشاہدہ اور ان کا انشائی مزاج مکمل رچ رچاؤ کے ساتھ ہم آمیز نظر آتا ہے۔ پروفیسر جمیل آذر اس انشائیے سے متعلق لکھتے ہیں:

''یوں تو ڈاکٹر وزیر آغا کے سارے انشائیے ہی ان کے مخصوص اسلوب اور فکر کی منہ بولتی تصویریں ہیں لیکن ''چرواہا'' میری دانست میں ان کے نمائندہ ترین انشائیوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ اس انشائیے کی پہلی قرأت ہی قاری کو اپنے اسلوب کی تازگی اور فکر کی گہرائی سے متاثر کرتی ہے۔۔۔ یہ انشائیہ اپنے چھوٹے کینوس پر لا محدود افکار کے رنگ بکھیرتا ہے۔۔۔ اپنے خاص سٹرکچر رنگ سے معنی کا لامختتم سلسلہ قاری کو فکری آسودگی عطا کرتا ہے۔''۸

''چرواہا'' سات کتابی صفحات پر مشتمل ایک مختصر انشائیہ ہے جو چرواہے کے کردار کے گرد اپنا معنوی ہالہ قائم کرتا ہے۔ ہم سب نے زندگی میں بارہا چرواہے دیکھے ہیں لیکن اس کردار کی اتنی مختلف النوع جہتوں سے متعلق ہمارے اندر شاید ہی کبھی ایسے تفکرات نے جنم لیا ہو جن کا بیان وزیر آغا نے اپنے اس انشائیے میں کیا ہے۔ یوں یہ انشائیہ اپنے انشائیہ ہونے کی پہلی شرط پوری کرتا ہے کیوں کہ اس انشائیہ میں ایک انوکھے موضوع سے متعلق تمام ممکنہ احساسات اور تفکرات کو یک جان کر دیا گیا ہے جن سے تاحال قاری ناواقف تھا۔ یہ انشائیہ ایک انوکھے موضوع کے منفرد بیان کے ذریعے قاری کی فکر کو ایک نئی جہت عطا کرتا ہے اور اس پر حیرتوں کے نئے در وا کرتا ہے۔

اس انشائیہ کی ابتدا، انشائیہ نگار کی ایک چرواہے سے اچانک ملاقات سے ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار چرواہے سے دو سوال پوچھتا ہے ایک یہ کہ تم پہاڑوں کی مہیب تنہائی میں پہاڑ ایسا دن کیسے کاٹ لیتے ہو؟ اور دوسرا یہ کہ انسانوں کی غیر موجودگی میں باتیں کس سے کرتے ہو؟ ان دونوں سوالوں کے اسے انتہائی مختلف جوابات ملتے ہیں۔ چرواہا کہتا ہے میں اکیلا کہاں

ہوتا ہوں میرے ساتھ بھیڑیں، پہاڑیاں، جھاڑیاں اور چڑیاں ہوتیں ہیں۔ اور دوسرا یہ کہ باتوں کا کیا ہے وہ تو میں خود سے کرلیتا ہوں اپنی آواز سننے میں بڑا لطف آتا ہے۔ ان جوابات سے انشائیہ نگار پر چرواہے کے کردار کے اسرار کھلنے لگتے ہیں۔ اس پر یہ بھید کھلتا ہے کہ یہ تو مرد خود آگاہ ہے، کائنات کے سبھی رمز جانتا ہے، خود آشنا ہے، تنہا یہ نہیں تنہا تو ہم ہیں۔ یوں وہ اس کردار کی تہہ میں اترنے لگتا ہے اور یہ انکشاف کرتا ہے کہ چرواہا انسانی زندگی کے ان ایام کی یادگار ہے جب وہ بالکل اکیلا تھا جب وہ کسی دوسرے سے نہیں خود سے ہم کلام تھا اور ہمہ وقت خوش باش رہتا تھا۔ اس کے بعد وہ انسانی تہذیب کو تین ادوار میں پیش کرتا ہے۔

''پہلا ''چرواہے کا دور'' جو گزر چکنے کے باوجود ابھی تک نہیں گزرا۔ دوسرا ''کسان کا دور'' جو اپنی عمر طبعی گزار چکنے کے بعد اب جاں بہ لب ہے اور تیسرا ''بنئے کا دور'' جو ابھی ابھی شروع ہوا ہے۔''[9]

تین عام انسانی پیشوں کو انسانی تہذیب کے تین مختلف ادوار کی نمائندہ علامات بنا کر وزیر آغا نے تفکر کے کئی باب کھول دیے۔ مزید غور کیا جائے تو انہوں نے ان پیشوں کو انسان کی بنیادی جبلتیں اور صفات بھی بنا دیا۔ کہ انسان یا تو بنیا ہوتا ہے جس کی ساری قوت اور فکر کا تمام تر محور ''زر'' ہوتا ہے، یا وہ کسان ہے جس کی ساری قوت اور فکری محور ''زمین'' ہوتی ہے جس سے اوپر وہ کسی طور نہیں اٹھ سکتا۔ دراصل یہ دونوں انسانی قسمیں اپنی ان خود ساختہ زنجیروں سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ لیکن انسان کی ایک قسم چرواہا بھی ہے جو ہر طرح کی بندش اور قید سے آزاد ہے، جس کی اڑان کی کوئی سرحد نہیں۔ بنیا اپنی عیاری سے کسان کو اس کی ملکیت سے محروم کرنے پر تلا ہے اور جلد وہ اس میں کامیاب بھی ہو جائے گا لیکن وہ چرواہے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

''کیوں کہ چرواہے کی قوت زر یا زمین میں نہیں بل کہ اس کی چھڑی میں ہے۔ اور یہ چھڑی جادو کی وہ چھڑی ہے جو کبھی برق بن کر لہراتی ہے کبھی شبنم بن کر اترتی ہے، کبھی خیال بن کر اڑتی ہے، کبھی خوشبو کی طرح چاروں اور پھیل جاتی ہے اور کبھی دوبارہ چھڑی بن کر ریوڑ ہانکنے لگتی ہے۔ بنیا ہزار کوشش کے باوجود اس چھڑی پر قابض نہیں ہو سکتا کیوں کہ قبضہ تو صرف مرئی چیزوں پر کیا جا سکتا ہے۔'' [10]

چرواہے کی چھڑی کو غیر مرئی شے بتا کر اور اس کی قدرت کے اس تذکرے سے قاری اس بات سے واقف ہو جاتا ہے کہ چرواہا دراصل فن کار ہے وہ اپنے تخیل کی اڑان سے کائنات کو مسخر کرنے کی قوت رکھتا ہے اور اس کی چھڑی اس کا قلم ہے یا پھر اس کا برش جس سے وہ نت نئی تصویریں بنا سکتا ہے۔ اس کے بعد انشائیہ نگار اسے ایک پریمی کا روپ دے دیتا ہے کیوں کہ اسے اپنی فضاؤں میں لوک گیت سنائی دینے لگتے ہیں جو انھی چرواہوں کے نقش پا کے ساتھ سفر کرتے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچے اور پھر وہاں کی فضا میں گھل گئے۔ یہاں تک انشائیہ نگار کو چرواہے کا وصف خاص یہی لگتا ہے کہ وہ گیتوں کے بیج بکھیرتا پھرتا ہے۔ لیکن یہاں ایک بار پھر ٹھہر کر وہ مزید تفکر کرتا ہے کہ آخر چرواہے کا مسلک خاص ہے کیا؟ چرواہا تو مرد آزاد ہے، وہ تو اپنے ریوڑ کا بھی مطیع نہیں۔ کسی ڈھلوان، پہاڑ، میدان یا صحرا تک لا کر وہ اپنے ریوڑ کو آزاد کر دیتا ہے اور خود بھی آزاد ہو جاتا ہے۔ اپنے ریوڑ کی طرح وہ بھی کائنات میں بکھرنے لگتا ہے۔ بکھرنے اور پھر جڑنے کا یہ تمام عمل کائنات کے طرز عمل سے مشابہ ہے۔

اس کے بعد انشائیہ نگار چرواہوں کی بھی تین اقسام بتاتا ہے ایک وہ جو محض مزدوری کرتے ہیں، دوسرے وہ جو پریمی ہیں لیکن چرواہوں کی یہ دونوں اقسام انشائیہ نگار کا مخاطبہ نہیں اس کا مخاطب تو وہ چرواہے ہیں:

''جو مویشیوں کے ریوڑ چراتے چراتے ایک روز انسانوں کے ریوڑ چلانے لگتے ہیں۔ تب ان کی چھڑی عصا میں بدل جاتی ہے۔ اور ہونٹوں پر اسم اعظم تھرکنے لگتا ہے۔'' [11]

چرواہے کی چھڑی کو عصا اور چرواہے کو انسانی ریوڑ کا پاسباں بتا کر بالآخر انشائیہ نگار چرواہے کی پیغمبری صفات کو واضح کر دیتا ہے اور اس کردار کی عظمت کے تمام راز افشا کر دیتا ہے۔ یوں چرواہے کی آزاد منشی، اس کی وسیع اڑان، اس کی تخلیقیت، اس کا وجدان اور اس کی رہبری کی تمام صفات مجتمع ہو کر یک جان ہو جاتی ہیں۔ ہونٹوں پر لرزنے والے گیت اسم اعظم کے تھرکنے میں بدل جاتے ہیں۔ یعنی یہ کردار اپنے ارتقا کی تمام صورتوں کے ساتھ منکشف ہو جاتا ہے۔ یہ انشائیہ اپنے فکری تحرک کے ساتھ ساتھ ادبی اعتبار سے بھی لائق مطالعہ ہے۔ لاتعداد شعریت اور افسانویت سے بھرپور سطریں اس کی خوب صورتی کو مزید بڑھاتی ہیں۔

- پھر اس کے بدن سے ایک نازک سی پسلی ٹھک کر علیحدہ ہوئی اور اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی۔
- وہ اپنی جگہ سے جنبش کئے بغیر ہی درخت کی پھننگ، پہاڑ کی چوٹی اور ابر پارے کی جھالر چھو سکتا ہے۔

سارا گلہ اس کی انگلیوں کی جھریوں سے دانہ دانہ ہو کر ہر طرف بکھر جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ خود بھی بکھرنے لگتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے خاک و افلاک پر ایک رداسی بن کر چھا جاتا ہے۔

چرواہے کے علامتی کردار کو واضح کرنے کے لیے بھی کئی طرح کی علامات تشکیل دی گئی ہیں۔ چھڑی کو کبھی ہوا کا جھونکا، کبھی برق، کبھی خوشبو، کبھی شبنم اور کبھی عصا سے تشبیہ دی گئی۔ لوک گیتوں کے لفظوں کو چرواہوں کے نقوش پا سے جب کہ ریوڑ کو تسبیح کے دانوں اور بعد ازاں فلک کے ستاروں سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی نئی نئی تشبیہات کا منفرد اور متاثر کن استعمال دکھائی دیتا ہے۔ جیسے

یہ ریوڑ اپنی کہنگی اور یبوست کو گندی اون کی طرح اپنے جسموں سے اتار پھینکیں۔

اس کے بعد وہ خود تسبیح کے دانوں کی طرح پوری کائنات میں بکھر جاتے ہیں جو بساط فلک پر ہر رات کروڑوں ستارے چمکتے ہیں کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ سب اسی تسبیح کے ٹوٹے ہوئے دانے ہیں۔

الغرض ''چرواہا'' انشائی اوصاف سے مملو ایک منفرد انشائیہ ہے۔ جس میں گہرے تفکر کی روشنی بھی ہے، وجدان کا عرفان بھی، کشف و تحیر کی چاشنی بھی اور ادبیت کا تڑکا بھی۔ جمالیاتی حظ اور عرفان ذات کو ادب کی بنیادی اقدار ہیں اس انشائیے میں بہ درجۂ اتم موجود ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر: ''اردو میں انشائیہ نگاری''، لاہور، نذیر سنز پبلشرز، ۱۹۸۹، ص ۱۶۔

۲۔ جمیل آذر، پروفیسر: ''انشائیہ کے روپ مختلف اصناف میں''، مشمولہ، ذوق نظر، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۲۰۱۳، ص ۱۵۷۔۱۵۹۔

۳۔ محمد اسد اللہ: '' آزادی اظہار کا مظہر انشائیہ''، مطبوعہ، انقلاب، ممبئی، مئی ۲۰۱۵، ۱۲، bazmeurdu,blogspot.com، ص ندارد۔

۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر: ''انشائیہ کا پیرجواں سال''، مشمولہ، ذوق نظر، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۲۰۱۳، ص ۲۱۔۲۲۔

۵۔ غفور شاہ قاسم، پروفیسر: ''پاکستانی ادب ۱۹۴۷ء سے تاحال''، لاہور، بک ٹاک، ۱۹۹۵، ص ۹۵۔

۶۔ جمیل ملک: ''ادبی منظر نامے''، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۶، ص ۳۲۶۔

۷۔ رشید امجد، ڈاکٹر: ''جدید ادبی تناظر''، راولپنڈی، الفتح پبلی کیشنز، ۲۰۱۲، ص ۱۴۲۔۱۴۳۔

۸۔ جمیل آذر، پروفیسر: ''انشائیہ اور انفرادی سوچ''، راولپنڈی، نقش گر پبلی کیشنز، ۲۰۰۴، ص ۱۰۶، ۱۰۲۔

۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر: ''سمندر اگر، میرے اندر گرے''، لاہور، مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۸۹، ص ۲۶۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۷۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۰۔